یوسفی صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے برس

رضا علی عابدی
پاکستان

دنیا یوسفی صاحب کو ان کی بے مثال تحریروں سے یاد رکھے گی، میں خود کو ان خوش نصیبوں میں شمار کرتا ہوں جنھیں ان کا قرب حاصل ہوا اور جو انھیں ان کی شفقت، رواداری، عنایت اور محبت کے سبب یاد رکھیں گے۔ لندن میں اپنے قیام کے جو دو چار بڑے فائدے یاد رہیں گے ان میں ایک یہ ہے کہ میں نے کئی برس یوسفی صاحب کے قریب رہ کر گزارے، ان کو نزدیک سے دیکھا اور ان کے مشفقانہ برتاؤ سے میں نے کیسے کیسے فیض اٹھائے، میں ہی جانتا ہوں۔

کیسا عجب اتفاق ہے کہ آج جو ان کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو یادیں امڈ پڑی ہیں۔ وہ بے شمار شامیں، وہ محفلیں، وہ احباب کی مجلسیں، وہ ساتھ بیٹھ کر موسیقی سے لطف اٹھانا، شہر کے کسی تھیٹر میں ڈرامے دیکھنا، لوگوں کے مرنے جینے میں شریک ہونا، وہ چھوٹی بڑی ادبی نشستیں، اچھے برے مشاعرے، وہ سب تو یاد رہیں گے، لیکن جو یاد ان سے بڑھ کر ساتھ چلے گی وہ بیچ بیچ میں یوسفی صاحب کے تبصرے، فقرے اور چٹکلے وہ بھی بن مانگے۔ اس معاملے میں ذرا سے بھی بخیل نہیں تھے۔ دیر تک خاموش رہتے لیکن جوں ہی محسوس ہوتا کہ کچھ کہنے کو ہیں، لوگ چپ سادھ لیتے کہ اب حس مزاح کا کوئی شاہکار نزول کے قریب ہے۔ کراچی میں آخری ملاقات کے دوران اپنی نقاہت کے دوران بولے۔ ''صاحب لمبی عمر کا یہ فائدہ ہے کہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ کس طرح یاد کریں گے''۔ پھر کچھ دعاؤں کی بات چلی اور میں نے کہا کہ خدا جانے کیا بات ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ بولے ''صاحب، دوسروں کے لیے کی جائیں تو قبول ہو جاتی ہیں''۔

یوسفی صاحب نے بہت لکھا، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس سے زیادہ پڑھا۔ حالات اور معاملات پر غضب کی نگاہ تھی۔ بات کہنا تو دور کی بات ہے، خاموش رہ کر سوچ رہے ہوتے تھے تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ حکمت کے کسی گوہر کی جستجو میں ہیں۔

جستجو میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لفظوں کی تلاش میں جیسا ہم نے انھیں منہمک دیکھا، کسی کو نہیں دیکھا۔ اوّل تو یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں شرمائے کہ کسی مخصوص شے کا نام انھیں نہیں معلوم، دوسرے دو چار احباب خصوصاً خواتین کو فون کر کے پوچھنا کہ، مثلاً اگلے دانتوں کے درمیان جو خلا ہوتا ہے، اسے کیا کہتے ہیں؟ پھر یہ ہوتا کہ جتنے لوگ اس جستجو میں شریک ہوتے تھے انھیں ایک دلچسپ مشغلہ مل جاتا تھا۔ 'کھکیڑ' اور روکن جیسے لفظ انھوں نے یوں ہی تلاش کیے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ اردو میری زبان نہیں۔ اپنی ہر تحریر کسی اہلِ زبان کو ضرور دکھاتے تھے۔ ان کی زیادہ تر تحریریں اشاعت سے پہلے شان الحق حقی صاحب کو دکھائی گئی تھیں۔

ان کے تجسس کا تو کیا کہنا۔ لوگوں کی باتیں اتنی توجہ سے سنتے تھے کہ جیسے یہ سوچ کر کہیں ذخیرہ کر رہے ہوں کہ یہ سارے قصے کبھی کام آئیں گے۔ کراچی میں 'لیاری' کے محلّے کو انھوں نے یوں ہی جانا ہوگا ورنہ ان گلی کوچوں کو اتنی تفصیل سے انھوں نے کب دیکھا ہوگا کہ آبِ گم میں علاقے کو اور اس کے باشندوں کو یوں بیان کر دیا جیسے عمر وہیں کہیں بسر کی ہو۔

ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تو ہمارے ہم عمر ہو جاتے اور ہر قسم کی ہنسی مذاق میں برابر کے شریک ہوتے۔ ایک دور ایسا تھا جب لندن میں مشاعروں پر مشاعرے ہونے لگے تھے۔ افتخار عارف، میں، میری اہلیہ ماہ طلعت، ہم سب کی ہمشیرہ شاہدہ احمد اور ان کے شوہر عزیز احمد حوصلہ افزائی کے خیال سے ہر چھوٹے بڑے مشاعرے میں جاتے اور یوسفی صاحب ہمارے ساتھ ہوتے۔ جب جگہ جگہ وہی پرانی بیاضوں سے پرانا کلام سنتے سنتے ہم تنگ آ گئے تو میری بیوی نے کہیں یہ تجویز پیش کر دی کہ ایک انجمن بنائی جائے جس کا نام 'انجمن انسدادِ بے رحمی بر سامعین مشاعرہ' رکھا جائے۔ یہ خیال یوسفی صاحب کو اتنا پسند آیا کہ پھر کئی روز اس میں خیال آرائیاں ہوتی رہیں اور اس کے منشور میں بھانت بھانت کی شقیں شامل ہوتی رہیں۔ بات پرانی ہوئی، وہ ساری پر لطف باتیں ذہن سے محو ہو چلی ہیں۔

یوسفی صاحب جو برجستہ فقرے چست کرتے تھے وہ تو ہاتھ کے ہاتھ تخلیق ہوتے، لیکن جب کبھی وہ پرانے قصے سناتے تو ان کا لطف الگ ہی تھا۔ ان کا بیان کیا ہوا وہ قصّہ بھلائے نہیں بھولتا جب وہ پاکستان بینکنگ

کونسل کے چیئر مین تھے۔ یہ بلاشبہ اونچا عہدہ اور مقام تھا اور کسی نے اڑا دی تھی کہ یوسفی صاحب بلا کے بد دماغ ہیں۔ ہوں گے کہ ہم نے ان کا وہ زمانہ نہیں دیکھا، لیکن جب وہ لندن آئے اور ہم سب پہلی بار کہیں کھانے پر ملے تو خواتین نے کمال کیا۔ بڑی سادگی کے ساتھ یوسفی صاحب سے بولیں۔ 'ہم نے تو سنا تھا کہ آپ بہت بد دماغ ہیں، ہمیں تو آپ ذرا سے بھی چڑچڑے نہیں لگے'۔ اس روز ہم نے پہلی بار انھیں کھل کر ہنستے دیکھا اور شاید وہ ان کی رسوائے زمانہ بد دماغی کا آخری دن تھا۔

ہاں وہ قصّے کی بات رہی جارہی ہے۔ یوسفی صاحب بینکنگ کونسل کے سربراہ تھے۔ ایک روز جوش صاحب چوتھی منزل پر ان کے دفتر جا پہنچے اور کہا کہ یوسفی صاحب، میں ایک لڑکے کو ساتھ لایا ہوں، یہ فلاں خاتون کا بھائی ہے، اسے اپنے ادارے میں ملازمت دیجیے۔ یوسفی صاحب نے انکار کے جتنے مہذّب نسخے ہو سکتے تھے، سارے آزما لیے، لیکن جوش صاحب نہ صرف اڑے رہے بلکہ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھے کہ آپ لڑکے کو ملازمت نہیں دیں گے تو میں اس کھڑکی سے کود کر جان دے دوں گا۔ اس کے آگے یوسفی صاحب اتنا کہہ کر رہ گئے کہ انھوں نے جوش صاحب کو کس مشکل سے روکا، لیکن ہم یہ تصور کر کے لوٹ پوٹ ہو رہے کہ کہاں جوش صاحب کا وہ تن و توش اور کہاں چھوٹے سے قد کے دبلے پتلے ہمارے یوسفی صاحب، ان دونوں نے زور آزمائی کی ہوگی تو کیا منظر ہوگا۔

وضع داری یوسفی صاحب پر ختم تھی۔ وہ اور حقی صاحب کبھی سوٹ اور ٹائی کے بغیر گھر سے نہیں نکلے۔ یوسفی صاحب کا تو یہ عالم تھا کہ ایک بار شدید بیمار ہوئے اور ہنگامی طور پر اسپتال جانا پڑا جہاں انھیں گہری نگاہ داشت کے وارڈ میں رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہاں مریض کو اسپتال کا لباس پہننا ہوتا ہے، اس کا حلیہ سمٹا سمٹایا نہیں ہوتا اور بال بے ترتیب ہوتے ہیں۔ کئی لوگ انھیں اس حال میں بھی دیکھنے پہنچ گئے۔ وہی ہوا جو ہمیں اندیشہ تھا۔ یوسفی صاحب نے مارے مروّت کے ظاہر تو نہیں ہونے دیا، لیکن انھیں ناگوار گزرا اور دوسرے احباب کو پیغام گیا کہ جب تک وہ صحت کی بحالی کے کمرے میں نہ آجائیں، کوئی ان کی عیادت کو نہ آئے۔ اسی طرح جو لوگ اچانک اور خبر کیے بغیر ان سے ملنے پہنچ جاتے تو سخت پریشان ہوتے تھے۔ ہاں آخر آخر میں ہم نے پہلی بار انھیں کرتے شلوار میں دیکھا۔

کچھ بھی ہو، ان کی مزے مزے کی باتیں بہت یاد رہیں گی۔ خود ہی بتا رہے تھے کہ پاکستان میں کوئی نوجوان ایم فل کر رہا تھا اور یوسفی صاحب پر اسے تحقیقی مقالہ لکھنا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ اس نے لکھ لیا، لیکن سوانح لکھنے کے لیے اس نے یوسفی صاحب کو ایک سوال نامہ بھیجا اور جواب کی درخواست کی۔ یوسفی صاحب ٹھہرے بہت ہی مصروف انسان، طالب علم کے خط کا جواب نہ دے سکے۔ غرض اس نے دو چار بار خط لکھ کر یاد دہانی کرائی، یوسفی صاحب نظر انداز کر گئے۔ خود بتاتے ہیں کہ صاحب پھر جو اس کا خط آیا تو ہماری جان ہی نکل گئی۔ اس نے لکھا کہ یا تو اپنی سوانح لکھ کر بھیجیے ورنہ میں اپنی مرضی سے لکھ دوں گا۔

مجھے ان کی سادگی نے ہمیشہ بہت متاثر کیا۔ ایک بار بیگم یوسفی کچھ عرصے کے لیے انھیں گھر پر چھوڑ کر کہیں گئیں اور گھر کی دیکھ بھال یوسفی صاحب کے ذمے کر گئیں۔ یوسفی صاحب نے نہایت مستعدی سے گھر پر نگاہ رکھی۔ خود ہی بتاتے ہیں کہ کئی روز تک فلیٹ میں آراستہ پودوں کو پانی دیتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پودے اصلی نہیں، پلاسٹک کے تھے۔

خود اپنے اوپر ہنسنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس میں سارا کمال انسان کے ظرف کا ہوتا ہے اور یہ ہنر ان کو خوب خوب آتا تھا۔ ان کی بعض باتیں ہم لوگ ہمیشہ دہراتے رہیں گے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ جو کچھ لکھتا ہوں، پہلے اسے کچھ عرصے کے لیے پال میں رکھتا ہوں، پھر اسے نکال کر پڑھتا ہوں اور کسی قابل سمجھتا ہوں تو اسے آگے بڑھاتا ہوں۔

لکھ کر کاٹتے نہیں تھے۔ ایک ورق پر ایک پیراگراف لکھتے تھے، کچھ بدلنا ہو تو پورا ورق منسوخ کر دیتے تھے۔ یہ تو ایک ورق کی بات ہے، یوسفی صاحب نے اپنی لکھی ہوئی پوری کتاب منسوخ کر دی۔ کم سے کم ہمیں یہی بتایا گیا۔ پہلے تو خود ان ہی نے بتایا کہ ایک ناول لکھ رہے ہیں، پھر یہ بھی بتایا کہ نا کام بینک بی سی سی آئی کے زوال کے بارے میں ہے۔ ہمیں یہ تو اندازہ تھا کہ یوسفی صاحب نے اپنا لکھا ہوا پورا ناول پال میں ڈال دیا ہے، پھر یہ خبر ملی کہ ان ہی کے مخصوص لہجے میں ''نہیں صاحب، بات نہیں بنی''۔

آج خیال آتا ہے کہ کاش بات بننے یا نہ بننے کا فیصلہ انھوں نے ہم پر چھوڑ دیا ہوتا، مگر جس مشتاق احمد یوسف زئی کو ہم جانتے ہیں، اس سے یہ امید رکھنے کا خیال بھی مناسب نہیں۔ کچھ بھی ہو ہمیں تو یوں ہی لگے ہے کہ ادب کا ایک شاہکار وجود میں آتے آتے رہ گیا۔

کچھ بھی ہو، ایک بات طے ہے۔ جو کچھ یوسفی صاحب لکھ گئے ہیں، ہماری کئی نسلوں کے لیے بہت ہے۔ اپنے اگلے پڑاؤ پر جا کر اور اپنی دو چار کتابیں دکھا کر وہ 'قبلہ' کے مخصوص انداز میں بڑے فخر سے کہہ سکیں گے۔ ''صاحب، یہ چھوڑ کر آئے ہیں''۔

(بشکریہ: روزنامہ جنگ)

○○